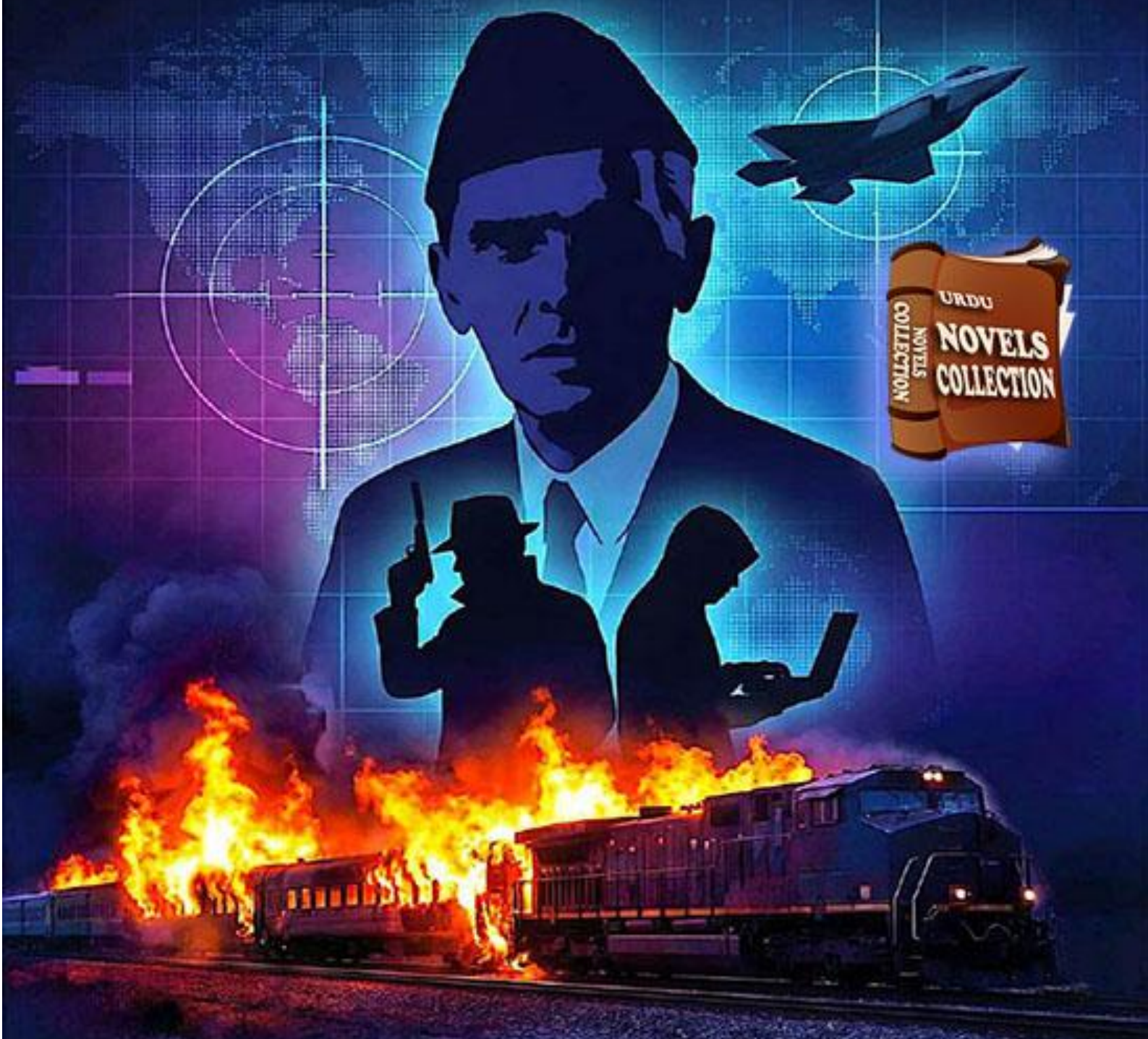


جنونِ منزل

ایک قوم کی داستانِ سفر: 1876 - 2025

واثق پیرزادہ



ناول: جنونِ منزل

(ایک قوم کی داستانِ سفر: 1876-2025)

مصنف: واثق پیرزادہ

صنف: تاریخی فکشن / تھرلر

تمہید: خون، دھول اور امید

تاریخ: 14 اگست، 1947

مقام: واہگہ بارڈر کے قریب، مہاجرین کا ایک قافلہ

آسمان کا رنگ سرخی مائل تھا، شاید سورج ڈوب رہا تھا یا شاید زمین سے اٹھنے والے دھوئیں اور آگ کے شعلوں نے شفق کو نگل لیا تھا۔ فضا میں بارود، جلی ہوئی لکڑی اور انسانی خون کی ملی جلی بورچی ہوئی تھی جو سانس لینا دشوار کر رہی تھی۔

بوڑھے رحیم بخش نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے بیل گاڑی کا پیہہ درست کیا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں کئی صدیوں کی تھکاوٹ تھی، لیکن آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گرد و غبار میں لپٹے ہزاروں لوگ — مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے — پیدل چل رہے تھے۔ کسی کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا، کسی کے کاندھے پر زخمی باپ تھا، اور کسی ماں کی چھاتی سے دودھ کی بجائے خون رس رہا تھا، مگر قدم رک نہیں رہے تھے۔

"!دور کہیں سے نعروں کی گونج سنائی دی —" پاکستان زندہ باد

یہ نعرہ نہیں تھا، یہ ان لاکھوں لوگوں کے دل کی وہ دھڑکن تھی جو اپنا گھر بار، اپنی زمینیں، اپنے اجداد کی قبریں اور اپنا ماضی لٹا کر ایک انجانے مستقبل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رحیم بخش نے اپنے پوتے کے سر پر ہاتھ پھیرا جو بھوک سے نڈھال بیل گاڑی میں پڑا تھا۔

دادا ابا! ہم کب پہنچیں گے؟" بچے نے کمزور آواز میں پوچھا۔
 بوڑھے نے افق کی طرف دیکھا جہاں ایک سبز پرچم لہراتا محسوس ہو رہا تھا۔
 بس بیٹا... ہم اپنے گھر پہنچنے والے ہیں۔ وہ گھر جس کے لیے ہم نے "دریاؤں جتنا خون دیا ہے۔"

لیکن یہ کہانی اس دھول اڑاتے، لٹے پٹے قافلے سے شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ کہانی تو بہت پہلے شروع ہوئی تھی... ایک پرسکون حویلی میں، جہاں ایک بچے کی پہلی چیخ نے تاریخ کا رخ موڑنے کا اشارہ دیا تھا۔

(1876) باب اول: وزیر مینشن کا چراغ

دسمبر، 1876-کراچی 25

کراچی کی ہوائیں اس رات معمول سے زیادہ خنک تھیں۔ سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا کر ایک مدھر ساز پیدا کر رہی تھیں۔ شہر ابھی سو رہا تھا، لیکن کھارادر کی تنگ اور پتھریلی گلیوں میں واقع "وزیر مینشن" کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی روشن تھی۔

پونجا جناح، ایک کامیاب اور بارعب تاجر، اپنے کمرے کے باہر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں تھیں اور وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر دعا مانگتے۔ یہ رات ان کے لیے بہت بھاری تھی۔ گھر کے اندرونی حصے میں دائیوں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ اچانک، ایک بچے کے رونے کی آواز نے رات کے سنائے کو توڑ دیا۔

یہ رونا عام بچوں جیسا نہیں تھا؛ اس آواز میں ایک عجیب سی گونج تھی، ایک ایسی للکار تھی جیسے کسی نے آنے والے طوفانوں کو خبردار کیا ہو کہ "میں آ گیا ہوں۔"

پونجا جناح کے چہرے پر یکدم مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ چراغ کی مدہم روشنی میں، دایہ نے ایک ننھے وجود کو سفید ململ کے کپڑے میں لپیٹ کر ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ بچہ کمزور تھا، بہت چھوٹا، لیکن اس کی آنکھیں... وہ آنکھیں غیر معمولی تھیں۔ پونجا جناح نے جھک کر بچے کے ماتھے پر بوسہ دیا، جہاں قسمت نے ایک ایسی لکیر کھینچ دی تھی جو برصغیر کا نقشہ بدلنے والی تھی۔

مبارک ہو سیٹھ جی! اللہ نے چاند سا بیٹا دیا ہے، "دایہ نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "اس کا نام کیا رکھیں گے؟"

پونجا جناح نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں سمندر کی وسعتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک عزم اور یقین کے ساتھ کہا

"محمد علی... محمد علی جناح۔"

یہ نام اس کمرے کی دیواروں سے ٹکرایا اور تاریخ کے اوراق میں ثبت ہو گیا۔ یہ بچہ جو ابھی بامشکل آنکھیں کھول پا رہا تھا، اسے ابھی نہیں معلوم تھا کہ اسے مستقبل میں لندن کی سرد اور بے رحم عدالتوں سے لے کر دہلی کے گرم اور سازشی ایوانوں تک تنہا لڑنا ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک ایسی قوم کا وکیل بنے گا جس کا مقدمہ ہارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

کر دیا تھا۔ ہیر و سیٹج پر آچکا (Reset) وقت نے اپنی گھڑی کو ری سیٹ تھا۔

(سولہ سال بعد)

بندرگاہِ کراچی - 1892

سولہ سالہ محمد علی جناح بحری جہاز کے ڈیک پر کھڑا تھا۔ وہ اب بچہ نہیں رہا تھا، بلکہ ایک ذہین، دبے پتلے اور خوش لباس نوجوان میں ڈھل چکا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور رویے میں ایک غیر معمولی ٹھہراؤ۔ وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے لندن جا رہا تھا۔
 سمندر کی لہریں جہاز کے پینڈے سے ٹکرا رہی تھیں، جیسے اسے الوداع کہہ رہی ہوں۔ اس نے اپنے لمبے کوٹ کا کالر درست کیا اور افق کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں والد کی نصیحت گونج رہی تھی: "محنت کرنا اور کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنا۔"

اسے ابھی "قائدِ اعظم" بننے میں کئی دہائیاں باقی تھیں، لیکن اس کی شخصیت میں وہ فولاد ڈھل چکا تھا جس سے ٹکرا کر مخالفین پاش پاش ہونے والے تھے۔

لندن کی دھند آلود سڑکوں، لائبریریوں کی تنہائی اور شیکسپیر کے ڈراموں نے اس نوجوان کو تراشا۔ اس نے سیکھا کہ الفاظ تلوار سے زیادہ تیز کاٹ سکتے ہیں، اور خاموشی شور سے زیادہ بھاری ہو سکتی ہے۔

جب وہ واپس لوٹا، تو ہندوستان بدل چکا تھا۔ کانگریس کی سیاست عروج پر تھی، اور انگریز کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ لیکن جناح کی عقابی

نظریں دیکھ رہی تھیں کہ اس بھیڑ میں مسلمانوں کی حیثیت ثانوی ہوتی جا رہی ہے۔ ایک خاموش طوفان اس کے ذہن میں پل رہا تھا۔

(1930 - 1940) باب دوم: شاہین کی پرواز اور قرارِ دادِ لاہور

منظر 1: الہ آباد کا جلسہ گاہ — دسمبر 1930

سرما کی دھوپ مدہم پڑ رہی تھی، مگر پنڈال کے اندر گرمجوشی کا لاوا پک رہا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس جاری تھا۔ کرسیوں پر بیٹھے مندوبین کے چہروں پر مایوسی اور تھکاوٹ نمایاں تھی۔ ہندوستان کی سیاست ایک بندگلی میں کھڑی تھی اور مسلمان اپنی شناخت کی جنگ میں پسپا ہو رہے تھے۔ انگریز اور ہندو گٹھ جوڑنے انہیں دیوار سے لگا دیا تھا۔ تب، ڈائس پر ایک درویش صفت شخص کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال۔ ان کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جو عام سیاستدانوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے — وہ چمک اقتدار کی نہیں، بصیرت کی تھی۔ انہوں نے مائیکروفون سنبھالا۔ ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ سائیڈ پر کھڑے انگریز سی آئی ڈی والے اپنی نوٹ بکس تیار کر کے بیٹھ گئے، وہ الفاظ کی ٹوہ میں

تھے، مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ آج یہاں الفاظ نہیں، بلکہ ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی جانے والی ہے۔

اقبال کی بھاری اور پرسوز آواز گونجی۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بات کر رہے تھے، لیکن ہر جملہ ایک ہتھوڑے کی طرح سامعین کے ذہنوں پر لگ رہا تھا۔

میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک " ... واحد ریاست بنا دیا جائے

یہ محض ایک جملہ نہیں تھا، یہ ایک جغرافیائی اور سیاسی دھماکہ تھا۔ سامعین میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ کیا یہ شخص ایک الگ ملک کی بات کر رہا ہے؟ انگریز کے ہوتے ہوئے ایک الگ ریاست؟ مگر اقبال کی آنکھیں حال کے پردے چاک کر کے وہ نقشہ دیکھ رہی تھیں جو ابھی کاغذ پر بھی نہیں اتر ا تھا۔ انہوں نے ایک سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ کر بتایا کہ تم صرف ایک اقلیت نہیں، تم ایک الگ قوم ہو۔ خواب کا بیج بو دیا گیا تھا، اب اسے خون اور پسینے سے سینچنا باقی تھا۔

منظر 2: لندن سے واپسی اور طوفان کا پیش خیمہ

لندن کے ایک پر تعیش فلیٹ میں جناح خاموش بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ لیاقت علی خان اور دیگر رہنما ان کے سامنے مودب بیٹھے انہیں قائل کر رہے تھے: "قوم کو آپ کی ضرورت ہے۔ قائد! آپ کے سوا یہ کشتی کوئی پار نہیں لگا سکتا۔"

جناح جانتے تھے کہ واپسی کا مطلب کانٹوں کی سیج ہے۔ کانگریس کی مکاری، انگریز سرکار کا جبر، اور اپنوں کی سازشیں۔ لیکن جب انہوں نے اقبال کے خواب اور قوم کی بے بسی کا موازنہ کیا، تو ان کے اندر کا "وکیل" پیچھے ہٹ گیا اور "قائد" آگے بڑھا۔

جناح کی ہندوستان واپسی ایک خاموش طوفان کی طرح تھی۔ انہوں نے بکھری ہوئی، ٹوٹی ہوئی مسلم لیگ کو ایسے جوڑا جیسے مقناطیس لوہے کے ذروں کو کھینچتا ہے۔ وہ شہر شہر گئے، ان کی آواز میں وہ جادو تھا کہ مخالفین بھی سحر زدہ ہو جاتے۔

منظر 3: منٹو پارک، لاہور — 23 مارچ 1940

لاہور کا موسم بدل رہا تھا، بالکل ہندوستان کی تاریخ کی طرح۔ دریائے
 راوی کے کنارے منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) میں انسانوں کا
 ٹھاٹھیں مارتا سمندر اُٹ آیا تھا۔ تاحدِ نگاہ سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔
 دھول، پسینہ، اور جوش و خروش۔ فضا میں "اللہ اکبر" کے نعرے گونج
 رہے تھے جو شاہی قلعے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آرہے تھے۔
 پنڈال میں موجود غیر ملکی اور انگریز رپورٹرز حیران تھے کہ یہ کیسا اجتماع
 ہے؟ نہ کوئی موسیقی، نہ کوئی تماشہ، صرف ایک دبلے پتلے، بیمار مگر پر عزم
 شخص کو سننے کے لیے لاکھوں لوگ جمع تھے۔

قائد اعظم محمد علی جناح سٹیج پر آئے۔ ان کی شیروانی سفید براق تھی، ٹوپی
 ان کے عزم کی طرح سیدھی، اور چال میں بادشاہوں جیسا وقار۔ انہوں
 نے مونوکل (ایک آنکھ کی عینک) آنکھ پر لگائی اور مجمع پر ایک طائرانہ نظر
 ڈالی۔ لاکھوں لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔

جب وہ بولے، تو انگریزی میں بولے، لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ان پڑھ
 کسان اور مزدور بھی ہمہ تن گوش تھے جو انگریزی کا ایک لفظ نہیں سمجھتے

تھے۔ وہ زبان نہیں، لہجہ سمجھ رہے تھے۔ وہ اپنے قائد کی سچائی محسوس کر رہے تھے۔

پھر شیر بنگال مولوی فضل الحق سامنے آئے اور وہ تاریخی قرارداد پیش کی جس نے برصغیر کی تقسیم پر مہر ثبت کر دی۔

"! ہمیں ایک الگ، آزاد وطن چاہیے"

منٹوپارک نعروں سے لرزاٹھا۔ فضا میں ہاتھ لہرا رہے تھے۔ انگریز وائسرائے نے دہلی میں رپورٹ پڑھی تو طنزیہ مسکرا دیا، اسے لگایہ دیوانے کا خواب ہے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ منٹوپارک سے اٹھنے والی یہ چنگاری صرف سات سال میں برطانوی راج کے خرمن کو جلا کر رکھ دے گی۔ اس دن لاہور میں سورج غروب ہوا تو ایک نئی صبح کی نوید دے کر گیا۔ منزل کا تعین ہو چکا تھا۔ اب صرف راستے کی رکاوٹیں باقی تھیں۔ اور وہ رکاوٹیں خون مانگنے والی تھیں۔

(1946 - 1947) باب سوم: خون کی لکیر اور آگ کا دریا

(1946) منظر 1: دہلی کے ایوان — شطرنج کی آخری بازی

دہلی کا موسم شدید گرم تھا، سورج آگ برسا رہا تھا، لیکن وائسرائے ہاؤس کے سنگِ مرمر کے ٹھنڈے کمروں کے اندر ماحول برف کی طرح سرد اور تناؤ سے بھرپور تھا۔ یہ میز پر لڑی جانے والی جنگ کا آخری اور فیصلہ کن مرحلہ تھا۔

ایک طرف کانگریس کے قداور رہنما—نہرو اور پٹیل—تھے جو اپنی عددی اکثریت کے زعم میں تھے، اور دوسری طرف تن تنہا، دبلے پتلے مگر چٹان کی طرح مضبوط قائدِ اعظم محمد علی جناح کھڑے تھے۔ برطانوی حکومت نے "کینٹ مشن" بھیجا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی دلکش مسکراہٹ اور شاہانہ طمطراق کے پیچھے برصغیر کی تقسیم کا وہ خاکہ چھپائے بیٹھے تھے جو مسلمانوں کے لیے زہرِ قاتل ہو سکتا تھا۔ سازشوں کے جال بنے جا رہے تھے۔

جناح نے اپنی فائل میز پر رکھی۔ ان کی لمبی انگلیاں کانپ نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے 1946 کے انتخابات کے نتائج سامنے رکھ دیے۔ ان کی آواز میں وکیلوں والی دلیل اور لیڈروں والا حکم تھا:

مسلمانوں نے فیصلہ سنا دیا ہے۔ پاکستان اب ایک مطالبہ نہیں، ایک اٹل "فیصلہ ہے۔"

مسلم لیگ نے انتخابات میں تاریخی کامیابی حاصل کر کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ مخالفین کے پاس اب کوئی دلیل نہیں بچی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کو جھکنا پڑا، تقسیم ناگزیر ہو گئی، لیکن جاتے جاتے وہ ایک ایسی لکیر کھینچنے کی سازش کر رہے تھے جو صدیوں تک ناسور بنی رہے۔

منظر 2: ریڈ کلف کا بند کمرہ — جولائی 1947

سر سائریل ریڈ کلف، ایک برطانوی وکیل جو ہندوستان کے پیچیدہ جغرافیے، ثقافت اور دریاؤں کے بہاؤ سے بالکل نابلد تھا، اسے دنیا کا مشکل ترین کام سونپا گیا تھا: برصغیر کی تقسیم۔

کمرے میں نقشے بکھرے پڑے تھے۔ چھت والا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا، ہوا میں جس تھا۔ ریڈ کلف کے ہاتھ میں ایک پنسل تھی۔ باہر گرمی

تھی، مگر اس کے ماتھے پر پسینہ گھبراہٹ کا تھا۔ اسے کچھ "خاص ہدایات" موصول ہو چکی تھیں۔

اس کی پنسل پنجاب کے نقشے پر رکی۔ یہاں ایک عظیم سازش تیار ہو رہی تھی۔ ضلع گرداسپور... وہ واحد ضلع جس کا راستہ کشمیر کو جاتا تھا۔ اگر یہ پاکستان کو مل جاتا (جو اصولاً ملنا چاہیے تھا)، تو کشمیر کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔

لیکن ایک خفیہ اشارے پر، ریڈ کلف نے پنسل گھمائی اور لکیر تھوڑی سی موڑ دی۔ یہ محض ایک پنسل کی لکیر نہیں تھی، یہ لاکھوں انسانوں کے ڈیٹھ وارنٹ پر دستخط تھے۔ ایک غلط اور متعصبانہ فیصلے نے کشمیر کے مسئلے کو جنم دے دیا جو آنے والی نسلوں کے لیے جنگ کا میدان بننے والا تھا۔

منظر 3: موت کی ٹرین — اگست 1947

تاریخ: 14 اگست کے آس پاس

مقام: مشرقی پنجاب کا ایک ریلوے اسٹیشن

فضا میں سناٹا تھا، ایسا سناٹا جو طوفان سے پہلے ہوتا ہے۔ کھیتوں میں ہو کا عالم تھا۔ ایک پرانی بھاپ والی ٹرین "اسپیشل ٹرین برائے پاکستان" پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس کے ڈبوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چھتوں پر بھی انسانی سروں کا سمندر تھا۔ بوڑھے، بچے، جوان، عورتیں — سب کی آنکھوں میں خوف اور امید کا عجیب امتزاج تھا۔ انہوں نے اپنا سونا، چاندی، زمینی سب پیچھے چھوڑ دیا تھا، ساتھ لائے تھے تو صرف اپنی عزت اور ایمان۔

اچانک، کھیتوں سے "ہر ہر مہادیو" اور سکھوں کے جنگی نعرے بلند ہوئے۔ تلواروں، نیزوں اور کرپانوں کی چمک نے سورج کی روشنی کو بھی گھنا دیا۔

حملہ ہو چکا تھا۔

ٹرین کے ڈبوں میں قیامت خیز افراتفری مچ گئی۔ ایک بیس سالہ نوجوان، حیدر، اپنے بوڑھے نابینا باپ اور چھوٹی بہن کو بچانے کے لیے بوگی کے

دروازے پر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، صرف ایک ٹوٹا ہوا ڈنڈا اور ایمان کی طاقت۔

باہر خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بوگیوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ معصوم بچوں کو ہوا میں اچھال کر نیروں پر پرویا جا رہا تھا۔ چیخ و پکار نے انجن کی سیٹی کی آواز دبا دی۔ حیدر نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کٹ رہے ہیں، لیکن ٹرین ڈرائیور (جو ایک خدا ترس مسیحی تھا) نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس ٹرین کو رکنے نہیں دے گا، چاہے اسے آگ کے دریا سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔

انجن نے ایک زوردار چنگھاڑ ماری اور پیہے گھومنے لگے۔ ٹرین لاشوں کو روندتی ہوئی، پٹریوں پر بکھرے اعضاء کے اوپر سے گزرتی ہوئی رفتار پکڑنے لگی۔ حیدر کا بازو کرپان کے وار سے زخمی تھا، خون بہہ رہا تھا، لیکن اس نے اپنی بہن کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ باہر کا جہنم جیسا منظر نہ دیکھ سکے۔

منظر 4: لاہور ریلوے اسٹیشن — آزادی کی صبح

لاہور کے پلیٹ فارم پر ہزاروں لوگ اپنے مہاجر بھائیوں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پھول نہیں، بلکہ پانی کے برتن، روٹیاں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

دور سے ٹرین کی سیٹی سنائی دی۔ مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، لیکن جب ٹرین دھیرے دھیرے پلیٹ فارم پر داخل ہوئی تو سب کے کلیجے منہ کو آگئے۔

ٹرین سرخ تھی۔ پوری کی پوری ٹرین خون میں نہائی ہوئی تھی۔ بوگیوں سے خون ٹپک کر پلیٹ فارم کی مٹی کو رنگین کر رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ اندر لاشوں کے ڈھیر تھے۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن ان لاشوں کے درمیان سے حیدر، لڑکھڑاتا ہوا، خون میں لت پت باہر نکلا۔ اس کی گود میں اس کی چھوٹی بہن زندہ تھی۔

اس نے زمین پر قدم رکھا، لاہور کی مٹی کو چوما اور گر گیا۔

:اس کے خشک اور پھٹے ہوئے لبوں سے صرف ایک لفظ نکلا

"...! پاکستان"

قائد اعظم نے کراچی میں گورنر جنرل کا حلف اٹھایا، اور یہاں لاہور میں
مہاجرین نے اپنے خون سے اس کی توثیق کی۔ پاکستان بن چکا تھا، لیکن اس
کی قیمت بہت بھاری ادا کی گئی تھی۔

(1947 - 1948) باب چہارم: بقا کی جنگ اور ڈھلتا سورج

منظر 1: وادی کشمیر — اکتوبر 1947 (قبائلی یلغار)

سری نگر کی فضا میں بارود کی بورچی ہوئی تھی۔ پہاڑوں پر برف گر رہی
تھی، لیکن زمین پر خون گرم تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ الحاق کا ڈرامہ رچا کر بھارتی فوج کو
کشمیر میں اتار دیا تھا۔ پاکستان کی باقاعدہ فوج ابھی کمانڈ کے مسائل میں
الجھی ہوئی تھی (انگریز کمانڈران چیف جنرل ڈگلس گریسی نے قائد اعظم
کے واضح حکم کے باوجود فوج بھیجنے سے انکار کر دیا تھا)۔

لیکن قبائلی مجاہدین اور پاکستان کے ریٹائرڈ فوجیوں نے انتظار نہیں کیا۔

کیپٹن اسفندیار نے اپنی دور بین آنکھوں سے ہٹائی۔ وہ مظفر آباد کے قریب ایک چوٹی پر مورچہ زن تھا۔ اس کے ساتھ وزیرستان اور خیبر سے آئے ہوئے لشکر تھے۔ ان کے پاس جدید ٹینک نہیں تھے، پیروں میں مناسب جوتے نہیں تھے، لیکن سینوں میں ایمان کی آگ تھی۔
حملہ! "اسفندیار نے نعرہ لگایا۔"

پہاڑوں کے ذرے ذرے سے "اللہ اکبر" کی صدائیں گونجیں۔ پرانی راتفلوں اور جدید بھارتی مشین گنوں کا مقابلہ تھا۔ یہ جنگ علاقے کے لیے نہیں، بلکہ ان کشمیری ماؤں بہنوں کی عزت کے لیے تھی جن کی چیخیں سرحد پار سنائی دے رہی تھیں۔

اسفندیار اور اس کے ساتھیوں نے برق رفتار پیش قدمی کرتے ہوئے بھارتی فوج کو پسپا کر دیا تھا۔ وہ سری نگر کے ہوائی اڈے اور شہر کے ختم (Supplies) دروازے تک پہنچ گئے تھے، لیکن تبھی... رسد ہو گئیں۔ پیچھے سے بروقت مدد نہ پہنچ سکی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب جیت اور ہار کے درمیان صرف چند میل کا فاصلہ رہ گیا۔ جنگ بندی ہو گئی اور ایک لکیر

جو آج تک سلگ رہی—(LoC) کھینچ دی گئی—لائن آف کنٹرول ہے۔

منظر 2: زیارت ریزیڈنسی—اگست 1948

بلوچستان کی خنک فضا میں صنوبر کے قدیم درخت خاموش کھڑے تھے۔
زیارت ریزیڈنسی کی لکڑی کی دیواروں کے پیچھے موت اور زندگی کی کشمکش
جاری تھی۔

قائد اعظم محمد علی جناح بستر پر لیٹے تھے۔ وہ ہڈیاں اور کھال کا ڈھانچہ بن
نے ان کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دیا تھا، وہ (TB) چکے تھے۔ تپ دق
بمشکل سانس لے رہے تھے، لیکن ان کی آنکھیں اب بھی روشن
تھیں—ان میں وہی عقابی چمک تھی جس نے ہندو اور انگریز کو شکست
دی تھی۔

ان کی وفادار بہن، محترمہ فاطمہ جناح، ان کے سرہانے بیٹھی مسلسل ان کی
تیمارداری کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر کرنل الہی بخش مایوسی سے سر ہلا رہے تھے۔
"قائد نے دھیمی اور ٹوٹی ہوئی آواز میں پوچھا: "کشمیر...؟"

انہیں بتایا گیا کہ جنگ جاری ہے، قوم لڑ رہی ہے۔ ان کے زرد چہرے پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ آئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری جوا پاکستان پر لگا دیا تھا اور جیت گئے تھے، لیکن اب ان کا جسم جواب دے رہا تھا۔

ڈاکٹرز نے فیصلہ کیا: انہیں فوراً کراچی لے جانا ہوگا، جہاں سطح سمندر کی آکسیجن ان کے پھیپھڑوں کو کچھ راحت دے سکے۔

منظر 3: ماری پور روڈ، کراچی — 11 ستمبر 1948 (المیہ)

یہ تاریخ کا شاید سب سے دل دہلاؤ والا المناک منظر تھا۔

کراچی ہوئی اڈے پر گورنر جنرل کا طیارہ اتر ا۔ انہیں اسٹریچر پر ایمبولینس میں منتقل کیا گیا۔ لیکن قسمت کا کھیل دیکھیے... شہر کی طرف جاتے ہوئے، ویران اور ٹوٹی ہوئی سڑک پر، پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی ایمبولینس خراب ہو گئی۔ انجن نے ہچکی لی اور بند ہو گیا۔

شام کا دھند لکا چھا رہا تھا۔ گرمی اور حبس نے ماحول کو بو جھل بنا دیا تھا۔ ٹریفک کا شور دور سے آرہا تھا لیکن یہاں ویرانی تھی۔

فاطمہ جناح بے بسی سے اپنے بھائی کا ہاتھ تھامے ایسبوالینس کے اندر بیٹھی تھیں۔ مکھیاں قائد کے چہرے پر بھنبھنار ہی تھیں، اور فاطمہ جناح انہیں بار بار اپنے آنچل سے ہٹا رہی تھیں۔ وہ شخص جس نے برصغیر کی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا، جس نے کروڑوں لوگوں کو آزادی دلائی، وہ اس وقت ایک خراب کھٹارا ایسبوالینس میں، سڑک کنارے، مدد کا منتظر تھا۔ کوئی پروٹوکول نہیں، کوئی سائرن نہیں، کوئی گارڈ آف آنر نہیں۔ صرف خاموشی، جس اور موت کا انتظار۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دوسری ایسبوالینس آئی۔ انہیں گورنر جنرل ہاؤس پہنچایا گیا، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

پر، بابائے قوم نے آخری ہچکی لی۔ ان کے min رات کے 10 بجکر 20 :لبوں سے آخری الفاظ نکلے

"...اللہ... پاکستان"

کمرے میں موجود گھڑی کی ٹک ٹک رک گئی۔ ایک عہد تمام ہوا۔ سورج غروب ہو گیا، لیکن وہ اپنا نور "پاکستان" کی شکل میں چھوڑ گیا۔ قوم یتیم ہو گئی تھی۔

(1951 - باب پنجم: لیاقت باغ کی گونج اور جمہوریت کا زوال 1958)

منظر 1: کمپنی باغ (لیاقت باغ)، راولپنڈی — 16 اکتوبر 1951
 سہ پہر کا وقت تھا۔ راولپنڈی کے کمپنی باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ مسلم لیگ کے کارکنان اور عام شہری اپنے محبوب لیڈر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔

پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان، "قائدِ ملت"، سیٹج پر تشریف لارہے تھے۔ وہ سفید شیر وانی میں ملبوس تھے، چہرے پر وہی روایتی اور پراعتماد مسکراہٹ تھی، لیکن فضا میں ایک انجانا سا خوف تیر رہا تھا۔

سی آئی ڈی کی رپورٹس میں پہلے ہی خطرے کی گھنٹیاں بج چکی تھیں، انہیں مشورہ دیا گیا تھا کہ جلسہ منسوخ کر دیں، لیکن لیاقت علی خان نے کہا تھا:

"میں اپنی قوم سے ڈر کر نہیں چھپ سکتا۔"

جیسے ہی وہ ڈائس پر آئے، مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوئے اور اپنے پہلے الفاظ ادا کیے:

"... برادرانِ ملت"

بھیڑ کی پہلی صف میں بیٹھے ایک افغانی باشندے، سید اکبر نے اپنی پستول نکالی اور سید ہا نشانہ لیا۔

!ٹھاہ! ٹھاہ!

دو گولیاں سید ہی وزیراعظم کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ لڑکھڑائے اور ڈائس پر گر پڑے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ "قائدِ ملت کو گولی لگ گئی!" کی آوازیں گونجنے لگیں۔

لیکن اصلی تھرلر ابھی شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ پولیس قاتل (سید اکبر) کو گرفتار کرتی اور اس سے پوچھ گچھ کرتی کہ اس کے پیچھے کون ہے

(امریکہ؟ روس؟ یا کوئی اپنا؟)، وہاں موجود ایک پولیس انسپکٹر نے فوراً سید اکبر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

قاتل مر گیا، اور راز ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔ لیاقت علی خان کی آخری سانسوں کے ساتھ ہی پاکستان کی جمہوریت بھی نزع کے عالم میں آگئی۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا "ہائی پروفائل مرڈر" تھا جس کا خون رائیگاں گیا۔ (1953 - 1956) منظر 2: اقتدار کی شطرنج — گورنر جنرل ہاؤس لیاقت علی خان کے بعد اقتدار کی ایسی "میوزیکل چیئرز" شروع ہوئی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ سیاستدان کرسی کے لیے لڑ رہے تھے اور ملک یتیم ہو چکا تھا۔

ملک غلام محمد، ایک بیمار اور فالج زدہ بیوروکریٹ، گورنر جنرل کی کرسی پر براجمان تھے۔ وہ بولتے تو کچھ سمجھ نہیں آتا تھا، منہ سے رال ٹپکتی تھی، لیکن ان کے قلم میں ایسی آمرانہ طاقت تھی کہ وہ منتخب وزیراعظم (خواجہ ناظم الدین) کو گھر بھیج دیتے تھے۔

یہ سازشوں کا سنہرا دور تھا۔ دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ سیاستدان آپس میں دست و گریبان تھے اور بیوروکریسی ان کے سروں پر حکمرانی کر رہی تھی۔ اسکندر مرزا، جو ایک شاطر اور موقع پرست کھلاڑی تھے، پس پردہ ڈوریاں ہلارہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سیاستدان کمزور ہو چکے ہیں اور کی (GHQ) اب طاقت کا اصل مرکز پارلیمنٹ سے نکل کر جی ایچ کیو طرف منتقل ہو رہا ہے۔

(1958) منظر 3: اکتوبر کی سردرات — پہلا مارشل لاء

اکتوبر، 1958 7

رات کا سناٹا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اور آرمی چیف جنرل ایوب خان کے درمیان ایک خاموش معاہدہ طے پا چکا تھا۔ 1956 کا آئین، جو نو سال کی محنت کے بعد بنا تھا، اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔

"ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا: "ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسکندر مرزا کی خوشی عارضی تھی۔ وہ بھول گئے تھے کہ "نیام میں دو "تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

:اکتوبر، 1958 27

جنرل ایوب خان نے فیصلہ کر لیا۔ رات کے اندھیرے میں تین جرنیل صدر اسکندر مرزا کے بیڈروم میں داخل ہوئے۔ بندوق کی نوک پر استغفیٰ لیا گیا اور انہیں اسی رات ملک بدر کر کے لندن بھیج دیا گیا۔

اگلی صبح جب سورج نکلا، تو پاکستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ "فیلڈ مارشل ایوب خان" کا دور تھا۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک گشت کر رہے تھے۔ سیاستدان جیلوں میں تھے یا خاموش۔ عوام، جو سیاستدانوں کی روز روز کی لڑائیوں اور مہنگائی سے تنگ آچکے تھے، انہوں نے مٹھائیاں بانٹیں۔ انہیں لگا مسیحا آگیا ہے، لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ بوٹوں کی آوازاں دہائیوں تک پاکستان کے ایوانوں میں گونجنے والی ہے۔

(1965) باب ششم: ستمبر کا معرکہ اور بارود کی بارش

منظر 1: جمخانہ کا خواب — 6 ستمبر، صبح 3 بجے

لاہور گہری نیند سو رہا تھا۔ پرندے ابھی اپنے گھونسلوں میں تھے۔

سرحد کے اس پار، بھارتی جنرل چوہدری اپنی جیب کے بونٹ پر نقشہ پھیلائے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں فتح کا جام تھا اور ذہن میں جمخانہ کلب لاہور میں شام کی کاک ٹیل پارٹی کا نشہ۔

منصوبہ سادہ لیکن خطرناک تھا: بغیر اعلانِ جنگ کے، رات کے اندھیرے میں بین الاقوامی سرحد عبور کرو اور صبح کا ناشتہ لاہور میں کرو۔

بھارتی ٹینکوں کے انجن سٹارٹ ہوئے۔ واگہ بارڈر کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی۔ یہ حملہ کسی بہادر کا نہیں، بلکہ "چور" کا تھا جو گھر کے پچھواڑے سے نقب لگاتا ہے۔

لاہور کی سرحد پر تعینات مٹھی بھر پاکستانی جوانوں نے اچانک زمین کی تھر تھراہٹ اور گرد کا طوفان دیکھا۔ انہوں نے ہیڈ کوارٹر پیغام بھیجا: "!!" دشمن آگیا ہے

لیکن جواب کا انتظار کیے بغیر، انہوں نے اپنی رائفلیں اور مشین گنیں سیدھی کر لیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے پیچھے پورا لاہور بے خبر سو رہا ہے، اور اگر وہ ہٹے تو دشمن ان کے گھروں، ان کی بیٹیوں تک پہنچ جائے گا۔

منظر 2: بی آر بی نہر — فولادی دیوار (میجر عزیز بھٹی شہید)
 سورج نکل چکا تھا، لیکن برکی سیکٹر میں دھواں چھایا ہوا تھا۔ بھارتی ٹینکوں کا
 ایک پورا لشکر آگے بڑھ رہا تھا، لیکن ان کے راستے میں ایک رکاوٹ تھی:

Bumbanwala-Ravi-Bedian) بی آر بی نہر

اور ایک شیردل شخص — میجر راجہ عزیز بھٹی۔ (Canal)

میجر بھٹی پچھلے کئی دنوں سے سوئے نہیں تھے۔ وہ خندق میں کھڑے،
 دور بینی سے دشمن کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے اور اپنی چھوٹی سی ٹکڑی
 کو فائر کے احکامات دے رہے تھے۔

بھارتی ٹینک گولے برسارہے تھے۔ مٹی اڑ رہی تھی۔ درخت جل رہے
 تھے۔ ان کے ساتھی کہہ رہے تھے: "سر! آپ بہت ایکسپوز ہو رہے

"! ہیں، نیچے ہو جائیں، سناپرز کی رینج میں ہیں

: لیکن میجر بھٹی نے وہ تاریخی جملہ کہا

میں اپنی قوم کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ میں یہیں رہوں گا۔ دشمن میری لاش"
 "پر سے گزر کر ہی لاہور جاسکتا ہے۔

چھ دن اور راتیں... وہ شخص بھوک، پیاس اور نیند سے بے نیاز، ایک آہنی دیوار بن کر کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ٹینک کا گولہ سیدھا ان کے سینے پر لگا۔ وہ گر گئے، جامِ شہادت نوش کیا، لیکن تب تک بھارتی فوج کالاہور میں!

ناشتے کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ لاہور بچ گیا تھا

منظر 3: سرگودھا کے شاہین — 7 ستمبر (ایم ایم عالم کارپکارڈ)

فضا میں جیٹ طیاروں کی خوفناک گرج تھی۔ بھارتی ہنٹر طیارے سرگودھا ایئر بیس کو نشانہ بنانے کے لیے آئے تھے۔

لیڈر ایم ایم عالم (لٹل ڈی رن وے پر ایک چھوٹا سا قد آور شخص، سکوا سیبر طیارے میں بیٹھا۔ F-86 ڈریگن)، اپنے انجن نے آگ اگلی اور طیارہ فضا میں بلند ہوا۔

یہ فضائی جنگ کی تاریخ کا ایک ناقابل یقین اور معجزاتی منظر تھا۔ ایم ایم عالم نے دشمن کے طیاروں کو گھیر لیا۔ ان کی انگلیاں ٹریگر پر تھیں۔

ایک... دو... تین... چار... پانچ

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں، ایم ایم عالم نے 5 بھارتی ہنٹر طیارے مار گرائے۔ آسمان پر دھوئیں کی لکیریں بن گئیں۔ بھارتی پائلٹ بوکھلا گئے اور دم دبا کر بھاگ گئے۔ یہ ایک ایسا عالمی ریکارڈ تھا جو آج تک قائم ہے۔

منظر 4: چونڈہ کا قبرستان — ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ سیالکوٹ کے قریب "چونڈہ" کا میدان۔

یہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی لڑی گئی۔ بھارتی فوج اپنے 600 جدید ٹینکوں کے ساتھ اس علاقے کو روندنے آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جی ٹی روڈ کاٹ کر پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔

زمین تھررا رہی تھی۔ پاکستانی ٹینک کم تعداد میں تھے، لیکن پاکستانی جوانوں کا جنون ان ٹینکوں کے لوہے سے زیادہ مضبوط تھا۔

جب بارود ختم ہونے لگا، تو کئی پاکستانی سپاہیوں نے اپنے جسموں کے ساتھ بم باندھے اور بھارتی ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے۔ چونڈہ کا میدان بھارتی

ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔ دھول، دھواں، اور جلتے ہوئے لوہے کا ڈھیر۔
بھارت کا غرور خاک میں مل چکا تھا۔

(1970 - 1971) باب ہفتم: ٹوٹا ہوا تارا اور خونیں دسمبر

(1970) منظر 1: ڈھاکا کی گلیاں اور الیکشن کی رات

دریائے گنگا اور برہم پترا کے سنگم پر واقع مشرقی پاکستان میں ہواؤں کا رخ
بدل چکا تھا۔ فضا میں نمی کے ساتھ ساتھ بغاوت کی بورچی ہوئی تھی۔

کے انتخابات کے نتائج آچکے تھے۔ عوامی لیگ اور شیخ مجیب 1970
(Clean Sweep) الر حمن نے مشرقی پاکستان میں کلین سویپ
کر لیا تھا۔

اسلام آباد کے ڈرائنگ رومز میں موت کا سانسٹا تھا۔ جنرل یحییٰ خان، جو
جام و مینا کے شوقین تھے، اب اپنے مشیران کے ساتھ شش و پنج میں
تھے۔ قانون اور جمہوریت کا تقاضا تھا کہ اقتدار مجیب کو ملنا چاہیے، لیکن
مغربی پاکستان کے کچھ طاقتور حلقوں اور ذوالفقار علی بھٹو کو یہ منظور نہیں
تھا۔

"ایک عجیب سی، خود کش منطق پیش کی گئی: "ادھر ہم، ادھر تم۔
یہ نعرہ نہیں تھا، یہ پاکستان کے سینے پر چلنے والا وہ آرا تھا جس نے دو بازوؤں
کو کاٹ کر الگ کر دیا۔ ڈھاکا کے تاریخی پلٹن میدان میں لاکھوں بنگالی جمع
تھے، جواب "پاکستان زندہ باد" نہیں، بلکہ "جے بنگلہ" کے نعرے لگا
رہے تھے۔ شک کی خلیج اتنی گہری ہو چکی تھی کہ اب کوئی پل اسے پاٹ
نہیں سکتا تھا۔

منظر 2: آپریشن سرچ لائٹ — 25 مارچ کی خونی رات
مذاکرات کی میز الٹ چکی تھی۔ یحییٰ خان ڈھاکا سے خاموشی سے نکل گئے
اور کمان قصائی صفت جنرل ٹکا خان کے حوالے کر دی گئی۔

مارچ، 1971۔ رات کے 12 بجے۔ 25

ڈھاکا یونیورسٹی کے ہاسٹلز اور شہر کی سڑکوں پر پاکستانی ٹینک نکل آئے۔
"آپریشن سرچ لائٹ" شروع ہو چکا تھا۔ مقصد تھا طاقت کے زور پر
بغاوت کو کچلنا، لیکن طریقہ کار نے نفرت کی ایسی آگ بھڑکائی جو بجھائے
نہ ج بھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور مارٹر گولوں کے دھماکوں سے ڈھاکا گونج اٹھا۔
 بنگالیوں نے، جو کل تک ہمارے بھائی اور محافظ تھے، اب ہتھیار اٹھالیے
 (Guerrilla) "تھے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز باغی ہو گئی۔" "مکتی باہنی
 وجود میں آگئی۔ اب یہ سیاسی لڑائی نہیں تھی، یہ گلی محلے کی (Force)
 خونی جنگ بن چکی تھی۔

مشرقی پاکستان کی زمین دلدلی تھی، وہاں کے راستے اور جنگل مغربی
 پاکستان کے فوجیوں کے لیے اجنبی تھے۔ مکتی باہنی کے چھاپہ مار اپنے ہی
 فوجیوں پر گھات لگا کر حملہ کرتے اور پھر جنگلوں میں غائب ہو جاتے۔
 ہر گزرتے دن کے ساتھ پاکستان کی فوج وہاں تنہا ہوتی جا رہی تھی۔ سمندر
 کا راستہ بھارت نے روک لیا تھا، اور فضا میں بھارتی طیارے گدھوں کی
 طرح منڈلا رہے تھے۔

منظر 3: پلٹن میدان — 16 دسمبر 1971 (قیامت کا منظر)

ڈھاکا کی فضا انتہائی سوگوار تھی۔ سورج بادلوں میں چھپا ہوا تھا جیسے وہ یہ
 منظر دیکھنے کی تاب نہ رکھتا ہو۔ پرندے خاموش تھے۔

شام 4 بجکر 31 منٹ۔

پلٹن میدان میں ایک میز لگی تھی۔ اس کے گرد ہزاروں بنگالی اور بھارتی فوجی کھڑے جشن منا رہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔

جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، جن کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر شکست کی راکھ تھی، وہاں موجود تھے۔ ان کے سامنے بھارتی جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھے تھے۔

(Instrument of Surrender) "نیازی نے کانپتے ہاتھوں سے "سندِ الحاق پر دستخط کیے۔

پھر وہ لمحہ آیا جس نے ہر محبِ وطن پاکستانی کی روح کو جھنجھوڑ دیا، جس نے (Revolver) جناح کی قبر کو لرزادیا۔ جنرل نیازی نے اپنی ریوالور نکال کر جنرل اروڑہ کے حوالے کی اور اپنے کندھے سے رینک اتروائے۔ (Badges)

یہ صرف ہتھیار ڈالنے کا عمل نہیں تھا، یہ قائدِ اعظم کے پاکستان کے ٹوٹنے کا منظر تھا۔

ہزار فوجی اور شہری جنگی قیدی بنالیے گئے۔ 90

ریڈیو پاکستان پر ایک مختصر اور سکتہ طاری کر دینے والا اعلان ہوا: "مشرقی پاکستان میں جنگ بند ہو گئی ہے۔"

مغربی پاکستان میں لوگ دیوانہ ریڈیو پیٹ رہے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے، "دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔" ڈھاکا ڈوب گیا... ہمارا بازو کٹ گیا۔ اس رات پاکستان کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ دو قومی نظریہ لہولہان تھا، اور ملک آدھا رہ گیا تھا۔

(1972 - باب ہشتم: راکھ سے اٹھتا ہوا نقس اور ایٹمی خواب 1977)

منظر 1: راولپنڈی کا ایوانِ صدر — 20 دسمبر 1971
ملک کی فضاؤں میں سوگ تھا۔ ہر طرف مایوسی تھی، لوگ گلیوں میں سر جھکائے چل رہے تھے جیسے انہیں اپنی شناخت پر شرمندگی ہو۔ پاکستان کا

نقشہ کٹ چکا تھا۔ جنرل یحییٰ خان ذلت کے سائے میں ایوانِ صدر سے رخصت ہو رہے تھے۔

ایک شخص تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ تھی لیکن آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور عزم۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ انہوں نے قوم سے اپنے پہلے خطاب میں کوئی جھوٹی تسلی نہیں دی۔ انہوں نے ٹی وی کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہا:

"ہم ٹکڑوں کو جوڑیں گے... ہم ایک نیا پاکستان بنائیں گے۔"

یہ محض الفاظ نہیں تھے، یہ ایک مردہ جسم میں روح پھونکنے کی کوشش تھی۔ بھٹو نے آتے ہی فوج، بیوروکریسی اور عوام کو جھنجھوڑا۔ لوگ جو کل تک مایوس تھے، انہیں ایک نئی سمت مل گئی۔

منظر 2: ملتان کا خفیہ تہ خانہ — جنوری 1972 (ایٹمی بنیاد)

یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے خفیہ اور اہم ترین اجلاس تھا۔ ملتان میں بھٹو نے پاکستان کے چیدہ چیدہ سائنسدانوں کو جمع کیا۔

بھٹو جانتے تھے کہ روایتی جنگ میں بھارت کا مقابلہ مشکل ہے، اور بقا کا واحد راستہ "طاقت کا توازن" ہے۔

: انہوں نے سائنسدانوں کی طرف دیکھا اور جذباتی انداز میں گرجے
بھارت ایٹم بم بنا رہا ہے۔ ہمیں بھی یہ طاقت چاہیے۔ اگر ہمیں گھاس "
کھانی پڑی، ہم کھائیں گے۔ بھوکے رہیں گے، لیکن ہم اپنا ایٹم بم بنائیں
" گے۔

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک سائنسدان نے ہاتھ اٹھایا: "ہم یہ کر
" سکتے ہیں، لیکن ہمیں وسائل درکار ہوں گے۔

" بھٹو نے میز پر مکا مارا: "وسائل میں لاؤں گا، تم مجھے بم بنا کر دو۔
کی بنیاد "Project-706" اسی رات، پاکستان کے ایٹمی پروگرام
رکھ دی گئی۔ یہ بقا کی انشورنس پالیسی تھی۔
منظر 3: شملہ کا شطرنج—جولائی 1972

بھارت کا شہر شملہ۔ اندرا گاندھی فاتح تھیں، ان کے پاس پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی اور 5 ہزار مربع میل کا علاقہ تھا۔ بھٹو ایک شکست خوردہ قوم کے لیڈر تھے، جن کے ہاتھ بالکل خالی تھے۔

دنیا کو یقین تھا کہ اندرا گاندھی بھٹو کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیں گی۔ مذاکرات کی میز پر تناؤ تھا۔ اندرا چاہتی تھیں کہ مسئلہ کشمیر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اور اسے "لائن آف کنٹرول" مان لیا جائے۔

بھٹو ایک شاطر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے اندرا کی نفسیات سے کھیلا۔ رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کے دوران، بھٹو نے بغیر کچھ کھوئے، اندرا کو اس بات پر قائل کر لیا کہ اگر وہ خالی ہاتھ واپس گئے تو پاکستان میں فوج واپس آجائے گی جو بھارت کے لیے زیادہ خطرناک ہوگی۔

جادو چل گیا۔ معاہدہ طے پایا۔ 90 ہزار قیدی واپس آئے اور زمین بھی واپس ملی، اور کشمیر کا مسئلہ بھی زندہ رہا۔ یہ ڈپلومیسی کی تاریخ کا ایک ناممکن معجزہ تھا۔

(1977 - 1979) باب نہم: تختہ دار اور وردی کی آہٹ

منظر 1: آپریشن فیئر پلے—5 جولائی 1977 کی رات

کے کمروں (GHQ) اسلام آباد گہری نیند سو رہا تھا، لیکن جی ایچ کیو میں روشنی جل رہی تھی۔

کی تحریک نے ملک (PNA) بھٹو کی حکومت کے خلاف پی این اے کو مفلوج کر دیا تھا۔ سڑکوں پر "نظامِ مصطفیٰ" کے نعرے لگ رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق، جو بھٹو کے سامنے عاجزی کا پیکر بنے رہتے تھے اور اکثر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے، آج ان کے چہرے پر ایک سرد مسکراہٹ تھی۔

رات کے اندھیرے میں فوجی ٹرکوں نے وزیرِ اعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا۔ فون لائنز کاٹ دی گئیں۔

بھٹو کو جگایا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ فوج نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔

ضیاء الحق نے قوم سے خطاب میں وہ مشہور جملہ کہا جو تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ثابت ہوا :

میں صرف 90 دن کے لیے آیا ہوں۔ الیکشن کروا کر اقتدار منتخب "

"نمائندوں کے حوالے کر دوں گا اور بیرکوں میں واپس چلا جاؤں گا۔

لیکن یہ 90 دن 11 سالوں پر محیط ہونے والے تھے۔

منظر 2: وہ آخری رات — 3 اپریل، 1979

راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل۔ رات کا سناٹا موت سے زیادہ خوفناک تھا۔

جیلر یار محمد نے بھٹو کو بتایا کہ رحم کی اپیل مسترد ہو چکی ہے۔ وقت آگیا ہے۔

بھٹو، جو کل تک مسلم امہ کے لیڈر تھے، اب ایک بدبودار کوٹھری میں قید کی۔ انہوں نے اپنی (Shave) تھے۔ انہوں نے اطمینان سے شیو "بٹی بے نظیر سے کہا تھا: "میں تاریخ کے ہاتھوں میں زندہ رہوں گا۔

اپریل، صبح 2 بجے۔ 4

تارا مسیح (جلاد) تیار کھڑا تھا۔ بھٹو کو سٹرچر پر ڈال کر پھانسی گھاٹ تک لایا گیا (کیونکہ وہ بیماری اور کمزوری سے چل نہیں پارہے تھے)۔

اسٹرچر سے اتر کر وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے۔

سرپر کالا کپڑا ڈالا گیا۔ پھندا گلے میں فٹ کیا گیا۔

جلاد نے لیور کھینچا۔

! کھڑاک

ایک جھٹکا لگا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پاکستان کا پہلا منتخب وزیر اعظم جھول رہا تھا۔ ضیاء الحق کو لگا کہ باب بند ہو گیا ہے، لیکن قبر سے اٹھنے والی سیاست نے اگلی کئی دہائیوں تک پاکستان کا پیچھا نہیں چھوڑنا تھا۔

- (1979 - باب دہم: گرم پانیوں کی جنگ اور سرخ ریچھ کا شکار 1988)

منظر 1: آمودریا کا پل — 25 دسمبر 1979 (کرسمس کی رات)
دنیا کرسمس کی خوشیاں منا رہی تھی، لیکن افغانستان کے شمال میں، آمو پر خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی (Oxus River) دریا تھی۔

سوویت یونین (روس) کے ٹینکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا قافلہ افغانستان میں داخل ہو رہا تھا۔ "سرخ ریچھ" اپنی کچھار سے نکل چکا تھا۔

ان کا ہدف صرف کابل نہیں تھا، ان کی نظریں پاکستان کے راستے بحیرہ پر تھیں۔ (Gwadar/Karachi) "عرب کے" گرم پانیوں جنرل ضیاء الحق کے لیے یہ خبر کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ وہ دنیا میں تنہا تھے، لیکن راتوں رات وہ "مغرب کے لاڈلے" بن گئے۔

جنرل ضیاء نے نقشے پر انگلی رکھی اور مسکرائے: "ہم اسے روکیں گے" نہیں... ہم اسے یہاں دفن کریں گے۔

منظر 2: آبپارہ، اسلام آباد (آئی ایس آئی کا دار روم)

یہاں ایک خاموش جرنیل بیٹھا تھا، جس کا نام اخباروں میں نہیں آتا تھا لیکن دنیا کی سب سے بڑی خفیہ جنگ وہی لڑ رہا تھا۔ جنرل اختر عبدالرحمن (ڈی جی آئی ایس آئی)۔

ان کے سامنے میز پر سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی بیٹھے تھے۔

"Death by a thousand cuts": منصوبہ خطرناک تھا

(ہزار زخموں سے موت)۔

پاکستان کے قبائلی علاقے دنیا کی سب سے بڑی "گوریلا ٹریننگ کیمپ" میں بدل گئے۔ نوجوان، جو کل تک چرواہے تھے، اب کندھوں پر راکٹ لانچر رکھ کر ٹینک اڑانا سیکھ رہے تھے۔

منظر 3: جلال آباد کی پہاڑیاں — 1986 (سٹنگر کا جادو)

روسیوں کے "ایم آئی-24 ہینڈ" گن شپ ہیلی کاپٹر ز مجاہدین کے لیے موت کا پیغام تھے۔ یہ فضا میں رک کر آگ برساتے اور مجاہدین بے بس ہو جاتے۔

پھر وہ دن آیا جس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

ایک پہاڑی چوٹی پر مجاہدین چھپے بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک عجیب سا پائپ تھا — "سٹنگر میزائل"۔

فضا میں روسی ہیلی کاپٹر کی گونج سنائی دی۔ مجاہد نے پائپ کندھے پر رکھا، نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

... شششش

ایک سفید دھواں چھوڑتا ہوا میزائل نکلا اور سیدھا ہیلی کاپٹر کے انجن میں جا گھسا۔ فضا میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور "شیطان کا رتھ" بلے کا ڈھیر بن کر زمین پر آگرا۔

روسی پائلٹس میں خوف پھیل گیا۔ اب آسمان بھی محفوظ نہیں تھا۔ یہ سوویت یونین کی شکست کا آغاز تھا۔

منظر 4: دوستی کاپل — 15 فروری 1988

تاریخی لمحہ۔

سوویت جنرل بورس گروموف پل پر پیدل چل رہے تھے۔ وہ آخری روسی فوجی تھے جو افغانستان سے نکل رہے تھے۔ ان کے پیچھے ٹینکوں کی قطاریں واپس جا رہی تھیں۔

ایک سپر پاور، جس نے ہٹلر کو ہرایا تھا، وہ افغان پہاڑوں میں پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے مجاہدین اور پاکستان کی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھا چکی تھی۔

پاکستان نے دنیا کا نقشہ بدل دیا تھا۔ سوویت یونین ٹوٹ گیا، دیوار برلن گر گئی، لیکن پاکستان کو اس جیت کی بھاری قیمت چکانی پڑی — کلاشنکوف کلچر، منشیات اور فرقہ واریت نے معاشرے کی رگوں میں زہر گھول دیا تھا۔

(1988) باب یازدہم: جلتے ہوئے آم اور بہاولپور کی خونی شام

منظر 1: بہاولپور ایئرپورٹ — 17 اگست، سہ پہر 3:30 بجے
سورج آگ برسا رہا تھا۔ بہاولپور کی گرمی مشہور تھی، لیکن آج کی گرمی میں ایک عجیب سی گھٹن اور جس تھا۔

C-130 رن وے پر پاکستان کا سب سے محفوظ اور وی وی آئی پی طیارہ، کھڑا تھا۔ اس کے چار طاقتور انجن خاموش (Pak One) ہر کولیس تھے، لیکن ان کے پیٹ میں پاکستان کی پوری ملٹری اسٹیبلشمنٹ سوار ہونے والی تھی۔

صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق، جواب "فاتح افغانستان" کہلاتے تھے اور جن کی وردی کی طاقت کے سامنے پورا ملک سرنگوں تھا، وہ امریکی ٹینکوں

کا معائنہ کر کے واپس اسلام آباد جانے کے لیے تیار تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے دستِ راست اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل اختر عبدالرحمن اور امریکی سفیر آرنلڈ رافیل بھی تھے۔

سیکیورٹی انتہائی سخت تھی۔ ہر چیز چیک کی جا رہی تھی۔ لیکن... عین روانگی سے کچھ دیر پہلے، طیارے کے کارگو حصے میں کچھ لکڑی کی پیٹیاں لوڈ کی گئیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ "بہاولپور کے خاص آم" کا تحفہ تھا۔ کیا ان آموں کی پیٹیوں میں صرف آم تھے؟ یا ان کے اندر ٹائم بومز کا کنسٹر؟ (VX Nerve Gas) چھپی تھی؟ یا شاید زہریلی گیس یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آج تک بہاولپور کے ریت کے ذروں میں گم ہے۔

منظر 2: فضا میں ہچکولے — 3 بجکر 51 منٹ

کیا۔ وہ فضا میں بلند ہوا۔ (Take-off) طیارے نے ٹیک آف
 "Pak": پائلٹ ونگ کمانڈر مشہود نے کنٹرول ٹاور کو روٹین کا پیغام دیا
 One, clear for takeoff."

سب کچھ نارمل تھا۔

لیکن ٹیک آف کے چند منٹ بعد ہی کنٹرول ٹاور کا رابطہ ٹوٹ گیا۔
 عینی شاہدین (نیچے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان) نے دیکھا کہ طیارہ
 فضا میں عجیب حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ سیدھا جا رہا تھا، پھر اچانک اوپر اٹھتا،
 - جیسے پائلٹ (Roller-coaster motion) پھر غوطہ کھاتا
 کسی چیز سے لڑ رہا ہو، یا شاید پائلٹ کا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔
 کیا کاک پیٹ میں زہریلی گیس پھیل چکی تھی جس نے پائلٹس کو بے ہوش
 کر دیا؟ یا کنٹرولز جام ہو گئے تھے؟

اچانک، طیارہ سیدھا ناک کے بل زمین کی طرف آیا۔

!دھڑام

بستی لال کمال کے قریب زمین لرزا ٹھی۔ آگ کا ایک دیو ہیکل گولہ
، جو دنیا کا محفوظ ترین ٹرانسپورٹ طیارہ C-130 آسمان کی طرف لپکا۔
مانا جاتا تھا، چند سیکنڈز میں راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

منظر 3: بستی لال کمال کا جہنم

جب امدادی ٹیمیں اور مقامی لوگ وہاں پہنچے، تو منظر ایسا تھا جسے دیکھ کر
انسانی روح کانپ جائے۔

ہر طرف طیارے کے جلتے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ اور ان
ٹکڑوں کے درمیان... جلے ہوئے آم اور انسانی اعضاء کا ملغوبہ تھا۔ فضا
میں بارود، جیٹ فیول اور آموں کی ایک عجیب اور کراہیت آمیز بورچی
ہوئی تھی۔

پاکستان کا صدر، چیئر مین جوائنٹ چیفس آف سٹاف، اور امریکی سفیر—
سب ختم ہو چکے تھے۔

نہیں ملا۔ کوئی مستند ثبوت نہیں (Black Box) کوئی بلیک باکس ملا۔ یہ راز ضیاء الحق کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گیا۔ 1988 کا سال پاکستان کے لیے خونی سال ثابت ہوا۔

(1992 - 1998) باب دوازدہم: کرکٹ کاتاج اور چاغی کی گرج

منظر 1: میلبورن کا میدان — 25 مارچ 1992 (کارنر ڈٹائیگرز)

میں 87 ہزار (MCG) آسٹریلیا کے میلبورن کرکٹ گراؤنڈ تماشائی موجود تھے۔ فلڈ لائٹس کی روشنی میں سفید کپڑوں میں ملبوس پاکستانی ٹیم ایک ناممکن خواب کو حقیقت بنانے جا رہی تھی۔

ٹورنامنٹ کے شروع میں یہ ٹیم بکھری ہوئی تھی، شکست خوردہ تھی، لیکن کپتان عمران خان نے انہیں ایک جملے پر متحد کر دیا تھا

کارنر ڈٹائیگرز کی طرح لڑو۔ جب شیر زخمی ہوتا ہے تو وہ سب سے زیادہ "خطرناک ہوتا ہے۔"

فائنل میچ۔ انگلینڈ کو جیت کے لیے آخری وکٹ درکار تھی۔ وسیم اکرم کی جادوئی سوئنگ نے پہلے ہی ان کی کمر توڑ دی تھی۔

آخری اور۔ گیند عمران خان کے ہاتھ میں تھی۔

رچرڈ لنگ ورتھ نے شاٹ کھیلا، گیند ہوا میں بلند ہوئی... اور رمیز راجہ

! نے کچھ تھام لیا

امپائر کی انگلی اٹھی اور اس کے ساتھ ہی پورا پاکستان خوشی سے جھوم اٹھا۔

گلیوں میں بھنگڑے ڈالے گئے۔ ہوائی فائرنگ ہوئی۔

عمران خان نے کر سٹل ٹرائی ہوا میں بلند کی۔ ایک ٹوٹی ہوئی، مایوس قوم کو

1992 میں پہلی بار دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا نے کا موقع

ملا تھا۔

منظر 2: پوکھران کا دھماکہ — مئی 1998

چھ سال بعد، خوشی کی جگہ خوف نے لے لی۔

سرحد پار سے زمین لرزا اٹھی۔ بھارت نے راجستھان کے صحرا

"پوکھران" میں 5 ایٹمی دھماکے کر دیے۔

بھارتی وزیراعظم اٹل بھاری واجپائی مسکرا رہے تھے۔ بھارتی لیڈرز کا لہجہ تکبر سے بھر گیا۔ ایل کے ایڈوانی نے پاکستان کو دھمکی دی: "اب کشمیر کی بات ذرا سنبھل کر کرنا، حالات بدل چکے ہیں۔"

توازن بگڑ چکا تھا۔ پاکستان اب وجود کے خطرے میں تھا۔ اسلام آباد میں وزیراعظم نواز شریف پر شدید عالمی دباؤ تھا۔ ایک طرف امریکی صدر بل کلنٹن کا فون تھا: "دھماکے مت کرو، ہم تمہیں ڈالرزدیں گے، تمہارے قرضے معاف کر دیں گے۔" کلنٹن نے 5 بار فون کیا۔

دوسری طرف پاکستانی عوام اور فوج کا دباؤ تھا: "ہمیں روٹی نہیں چاہیے، ہمیں بم چاہیے! اگر آج جواب نہ دیا تو تاریخ معاف نہیں کرے گی۔" نواز شریف نے ایک مشکل اور جرات مندانہ فیصلہ کیا۔ انہوں نے فون رکھا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ڈاکٹر ثمر مبارک مند کو سگنل دے دیا: "!! بسم اللہ کریں"

منظر 3: راس کوہ کے پہاڑ، چاغی — 28 مئی 1998 (یومِ تکبیر)

بلوچستان کا ضلع چاغی۔ مئی کی شدید گرمی۔ راس کوہ کے خشک اور بنجر پہاڑ صدیوں سے خاموش کھڑے تھے، لیکن آج وہ بولنے والے تھے۔
میں سائنسدانوں کی ٹیم (Tunnel) پہاڑ کے اندر کھودی گئی سرنگ موجود تھی۔ سب کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ ٹریگر دبانے کا وقت آگیا تھا۔

سہ پہر 3 بج کر 16 منٹ۔

ڈاکٹر ثمر مبارک مند نے بٹن دبایا۔

پہلے چند سیکنڈ کچھ نہیں ہوا۔ ایسا لگا جیسے سسٹم فیل ہو گیا ہو۔ سائنسدانوں کے دل ڈوبنے لگے۔

لیکن پھر... زمین کے پیٹ سے ایک ہولناک گڑ گڑاہٹ پیدا ہوئی۔ پہاڑ ایسے کانپا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

پہاڑ کا رنگ، جو بھورا تھا، اچانک شدید حرارت سے سفید ہو گیا۔ اندر کا درجہ حرارت سورج کی سطح کے برابر پہنچ چکا تھا۔

دھول کے بادل اٹھے۔ اور اس گرد کے درمیان سے پوری ٹیم کا نعرہ بلند

:ہوا

"اللہ اکبر"

پاکستان دنیا کی ساتویں اور عالم اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بن چکا تھا۔ بھارت کا تکبر خاک میں مل گیا۔ پاکستانی عوام سڑکوں پر نکل آئے، ان کے پاس شاید کھانے کو کم تھا لیکن ان کا سر فخر سے بلند تھا۔ ہم نے اپنی بقا کی جنگ جیت لی تھی۔

(1999) باب سیزدہم: کارگل کی برفانی آگ اور فضا میں بغاوت

منظر 1: برفانی بھیڑیے — سیاچن اور کارگل

فروری 1999 میں جب لاہور میں "دوستی کی بس" آرہی تھی، اسی وقت کارگل کی 18 ہزار فٹ بلند چوٹیوں پر پاکستان کی "ناردرن لائٹ" کے کمانڈوز خاموشی سے بھارتی بنکرز پر قبضہ کر (NLI) "انفینٹری" رہے تھے۔

یہ "آپریشن کوہِ پیما" تھا۔

بھارت کو مئی میں جا کر خبر ہوئی کہ اس کے سر پر دشمن بیٹھ چکا ہے۔ جنگ چھڑ گئی۔ بھارتی فوج نے اپنی پوری طاقت، ایئر فورس اور بوفرز توپیں جھونک دیں، لیکن اوپر بیٹھے چند سو پاکستانیوں نے پوری بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔

منظر 2: ٹائیگر ہل کا شیر — کیپٹن کرنل شیر خان شہید
ٹائیگر ہل کے محاذ پر ایک پاکستانی شیر دھاڑ رہا تھا: کیپٹن کرنل شیر خان۔ وہ اپنی تھوڑی سی نفری کے ساتھ شدید بمباری کے باوجود ڈٹے ہوئے تھے۔ راشن ختم ہو چکا تھا، وہ برف کھا کر گزارا کر رہے تھے۔ انہوں نے نہ صرف دفاع کیا بلکہ جوابی حملہ کر کے بھارتیوں کو ان کے بیس کیمپ تک دھکیل دیا۔ بالآخر، مشین گن کی بوچھاڑ نے ان کا سینہ چھلنی کر دیا۔

جب بھارتی بریگیڈیئر ایم پی ایس باجوہ نے ان کی لاش دیکھی، تو وہ بھی سلیوٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے ان کی جیب میں ایک چٹ "رکھی": "یہ ایک بہادر سپاہی تھا، اس کا احترام کیا جائے۔"

منظر 3: پی آئی اے کی پرواز 805—12 اکتوبر، 1999 (فضا میں
سازش)

کارگل کی جنگ میز پر ہار دی گئی تھی، جس سے فوج اور حکومت میں دراڑ پڑ
گئی۔

اکتوبر، شام 5 بجے۔ 12

آرمی چیف جنرل پرویز مشرف سری لنکا سے واپس آرہے تھے۔ وہ پی آئی
میں سوار تھے۔ PK-805 اے کی کمرشل فلائٹ

ابھی جہاز فضا میں ہی تھا کہ وزیراعظم نواز شریف نے جنرل مشرف کو
برطرف کر دیا۔ اور کراچی ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور کو حکم دیا: "مشرف
"کا جہاز کراچی میں نہیں اترے گا۔"

ختم ہو رہا ہے، جہاز گر جائے گا۔ (Fuel) پائلٹ نے بتایا کہ ایندھن
لیکن نیچے رن وے کی لائنیں بجھادی گئیں۔ جہاز فضا میں چکر کاٹنے لگا۔
اندر بیٹھے 200 مسافروں کی جان خطرے میں تھی۔

لیکن زمین پر فوج حرکت میں آگئی۔ کور کمانڈرز نے حکومت کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ فوجی دستوں نے پی ٹی وی اور ایئر پورٹ پر قبضہ کر لیا۔ جہاز صرف 7 منٹ کے ایندھن کے ساتھ لینڈ کر گیا۔ جب جنرل مشرف جہاز سے باہر نکلے، تو وہ قیدی نہیں، بلکہ پاکستان کے نئے حکمران تھے۔ نواز شریف کو گرفتار کر لیا گیا۔ جمہوریت کا ایک اور باب بند ہو چکا تھا۔

(2001) باب چہار دہم: گرتے مینار اور تاریخ کا یوٹرن

منظر 1: نیویارک میں قیامت — 11 ستمبر، 2001

اسلام آباد میں شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ جنرل پرویز مشرف اپنے آفس میں معمول کی میٹنگ میں مصروف تھے کہ اچانک اے ڈی سی ہانپتا ہوا اندر آیا۔

"سر! ٹی وی دیکھیں... امریکہ میں کچھ ہوا ہے۔"

نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سینٹر دھوئیں کے بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طیارہ سیدھا دوسرے ٹاور میں جا گھسا۔

عمار تیں تاش کے پتوں کی طرح زمین بوس ہو گئیں۔ مشرف نے سکریں کی طرف دیکھا اور گہری سانس لی۔ وہ جان گئے تھے کہ یہ حملہ امریکہ پر نہیں، بلکہ دنیا کے مستقبل کے نقشے پر ہوا ہے۔

انہوں نے اپنے سٹاف سے کہا: "تیار ہو جاؤ... طوفان کا رخ ہماری طرف ہے۔"

"منظر 2: وہ فون کال — "ہمارے ساتھ، یا ہمارے خلاف

اگلے ہی دن واشنگٹن سے اسلام آباد کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

امریکی ڈپٹی سیکرٹری آف سٹیٹ رچرڈ آر میٹیج نے آئی ایس آئی کے

سربراہ کو فون کیا۔ سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے

دھمکی دی:

جنرل! صدر بوش کا پیغام ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف؟"

درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔ اگر آپ نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم پاکستان پر

"بمباری کر کے اسے پتھر کے دور میں پہنچا دیں گے۔"

مشرف ایک "دوراہے" پر کھڑے تھے۔ ایک طرف "اسلامی بھائی"
(طالبان) تھے، اور دوسری طرف پاکستان کی بقا۔

بھارت، امریکہ کو اڈے دینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اگر پاکستان انکار کرتا
تو امریکہ اور بھارت مل کر پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔
مشرف نے فیصلہ کر لیا۔

"منظر 3: قوم سے خطاب — "سب سے پہلے پاکستان

ستمبر کی رات۔ جنرل مشرف ٹی وی سکرین پر نمودار ہوئے۔ وہ اپنی 19
کمانڈ ووردی میں تھے۔

: انہوں نے وہ تاریخی تقریر کی جس نے پاکستان کا بیانیہ بدل دیا

اسلام خطرے میں نہیں ہے... لیکن پاکستان خطرے میں ہے۔"

دانشمندی یہ نہیں کہ جذباتی ہو کر خود کشی کر لی جائے۔ سب سے پہلے
"پاکستان۔"

یہ ایک یوٹرن تھا۔ پاکستان "فرنٹ لائن سٹیٹ" بن گیا، لیکن اس بار جنگ سرحد پار نہیں، بلکہ اپنے گھر کے اندر آنے والی تھی۔ خود کش جیکٹس سلنا شروع ہو گئیں۔

(2004 - باب پانزدہم: سرخ مسجد کا شعلہ اور خود کش جیکٹس 2007)

منظر 1: جنوبی وزیرستان کا دل دل—2004

جنرل مشرف کو یقین دلایا گیا تھا کہ وزیرستان میں صرف مٹھی بھر غیر ملکی دہشت گرد چھپے ہوئے ہیں اور ایک چھوٹا سا "پولیس ایکشن" کافی ہوگا۔ لیکن وہ غلط تھے۔

مارچ 2004۔ وانا کے قریب کالوشہ کا علاقہ۔

اور فوج کا ایک قافلہ علاقے میں داخل ہوا۔ اچانک (FC) فرنٹیر کور چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ پہاڑوں میں چھپے گوریلا جنگ کے ماہر ازبک اور چیچن جنگجوؤں نے فوج کو گھیر لیا۔

فوج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ مشرف کو احساس ہو گیا کہ یہ "پولیس ایکشن" نہیں، بلکہ ایک مکمل جنگ ہے۔ فوج نے پہلی بار اپنے ہی علاقے پر ہوائی بمباری کی۔ یہ آنکھ مچولی ایک نہ ختم ہونے والے خونی سلسلے میں بدل گئی۔

منظر 2: لال مسجد، اسلام آباد — جنوری تا جولائی 2007

اسلام آباد کی خوبصورت مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں، آپارہ مارکیٹ کے قریب "لال مسجد" واقع تھی۔ یہاں دو بھائی، مولانا عبدالعزیز اور عبدالرشید غازی، ریاست کی رٹ کو چیلنج کر رہے تھے۔

ڈنڈا بردار طالبات نے شہر میں اپنی عدالتیں لگالیں۔ چینی شہریوں کو اغوا کیا گیا۔ اسلام آباد کے شہری خوفزدہ تھے۔ حکومت نے مذاکرات کی بہت کوشش کی، لیکن بات "نفاذِ شریعت یا شہادت" پر اٹکی ہوئی تھی۔

جولائی 2007: ریجنل کے کرنل کی شہادت کے بعد صبر کا پیمانہ لبریز 3 ہو گیا۔ "آپریشن سائلنس" کا حکم دے دیا گیا۔

منظر 3: آپریشن سائلنس اور رد عمل

جولائی، صبح 4 بجے۔ 10

کے کمانڈوز مسجد میں داخل ہوئے۔ اندر شدید (SSG) ایس ایس جی مزاحمت تھی۔ تہہ خانوں میں چھپے دہشت گردوں نے گرینیڈ اور مشین گنز کا استعمال کیا۔ مسجد کا صحن جنگ کا میدان بن گیا۔ دھواں، آگ، اور چیخیں۔

کئی گھنٹوں کی خونریز لڑائی کے بعد عبدالرشید غازی مارے گئے۔ آپریشن ختم ہوا تو مسجد کھنڈر بن چکی تھی اور درجنوں لاشیں بلبے تلے دبی تھیں۔ لال مسجد کا آپریشن ختم ہوا، لیکن اس کی راکھ سے ایک عفریت نے جنم لیا۔ وزیرستان میں بیٹھے بیت اللہ محسود نے تحریک طالبان پاکستان کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد پاکستان میں خودکش دھماکوں کا وہ (TTP) دور شروع ہوا جس نے گلیوں کو قبرستان بنادیا۔

(2007) باب شانزدہم: لیاقت باغ کا دوسرا قتل اور امید کا غروب

منظر 1: کارساز کا استقبال — 18 اکتوبر 2007

سال کی جلا وطنی کے بعد "مشرق کی بیٹی" بینظیر بھٹو واپس آرہی 8
تھیں۔ کراچی میں لاکھوں کا مجمع تھا۔

رات کے 12 بجے۔ کارساز کے مقام پر بینظیر کے ٹرک کے قریب دو
خوفناک دھماکے ہوئے۔ آگ، دھواں، اور انسانی اعضاء۔ 180 لوگ
موقع پر شہید ہو گئے۔ بینظیر معجزانہ طور پر بچ گئیں۔ انہوں نے کہا: "ہم
"ڈر کر گھر نہیں بیٹھیں گے۔"

منظر 2: لیاقت باغ، راولپنڈی — 27 دسمبر کی شام
راولپنڈی کی فضا میں عجیب سی اداسی تھی۔ لیاقت باغ، جس نے پہلے وزیر
اعظم کا خون پیا تھا، آج پھر پیسا تھا۔

بینظیر نے جلسے سے خطاب کیا: "میں باغی ہوں... میں اس نظام سے باغی
"ہوں۔"

جلسہ ختم ہوا۔ وہ اپنی سفید لینڈ کروزر میں بیٹھ گئیں۔ جیالے باہر کھڑے
نعرے لگا رہے تھے۔ بینظیر، جو ہمیشہ عوام سے رابطہ رکھنا پسند کرتی تھیں،
سے باہر نکلیں تاکہ ہاتھ ہلا سکیں۔ (Sunroof) گاڑی کی سن روف

انتظار کر رہا تھا۔ (Assassin) یہ وہ غلطی تھی جس کا شکاری
بھیڑ میں ایک 15 سالہ لڑکے نے پستول نکالا۔

!ٹھاہ! ٹھاہ!

تین گولیاں چلیں۔ محترمہ گاڑی کے اندر گریں۔ اسی لمحے لڑکے نے خود
کو اڑا دیا۔

راولپنڈی جنرل ہسپتال کے باہر بابر اعوان نے روتے ہوئے اعلان کیا:
"محترمہ شہید ہو گئیں۔"

پاکستان رک گیا۔ سندھ جل اٹھا، ملک ٹوٹنے کے دہانے پر تھا۔ لیکن آصف
زرداری نے "پاکستان کھپے" کا نعرہ لگا کر فیڈریشن کو بچا لیا۔

(2011) باب ہفدہم: ایبٹ آباد کی کالی رات اور آپریشن جیرو نیمو

منظر 1: بلال ٹاؤن، ایبٹ آباد

پاکستان ملٹری اکیڈمی کا کول سے کچھ دور، اونچی دیواروں والا ایک پراسرار
گھر۔ سی آئی اے کو شک تھا کہ دنیا کا مطلوب ترین شخص، اسامہ بن لادن،
یہیں چھپا ہے۔

مئی 2011ء، رات 12:30 بجے۔ 2

امریکی "سٹیلٹھ بلیک ہاک" ہیلی کاپٹر پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچے۔ ریڈار ز خاموش رہے۔

نے گھر پر دھاوا بول دیا۔ تیسری منزل پر (SEALs) امریکی سیلز اسامہ بن لادن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

امریکیوں نے اسامہ کی لاش اٹھائی، اپنا تباہ شدہ ہیلی کاپٹر اڑایا اور 40 منٹ میں واپس نکل گئے۔

اگلی صبح جب قوم جاگی تو اسے اپنی خود مختاری تار تار ملی۔ دنیا پاکستان پر انگلیاں اٹھا رہی تھی کہ وہ نا اہل ہے یا شریکِ جرم۔ یہ ہماری تاریخ کا شرمناک ترین دن تھا۔

(2014) باب ہژدہم: سب سے چھوٹی قبریں اور عزم کی ضرب

منظر: آرمی پبلک سکول پشاور — 16 دسمبر 2014

پشاور میں دسمبر کی صبح معمول کے مطابق تھی۔ مائیں بچوں کو سکول بھیج رہی تھیں۔

صبح 10:30 بجے۔ 6 سفاک دہشت گرد سکول میں داخل ہوئے اور وہ قیامت ٹوٹی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے آڈیٹوریم میں جمع بچوں پر اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ کلاس رومز میں اساتذہ کو زندہ جلا دیا۔

پرنسپل طاہرہ قاضی نے کہا: "میں ان کی ماں ہوں، پہلے مجھے مارو۔" اور جان دے دی۔

جب آپریشن ختم ہوا تو 132 بچوں سمیت 149 لوگ شہید ہو چکے تھے۔ سکول کے سبز سویٹر خون میں نہا چکے تھے۔

اس شام پشاور میں سورج غروب نہیں ہوا، بلکہ شرم سے ڈوب گیا۔ ہر گھر سے جنازہ اٹھ رہا تھا۔ باپ اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی قبریں کھود رہے تھے۔

اس غم نے قوم کو جوڑ دیا۔ "ضربِ عضب" شروع ہوا۔ دہشت گردوں کو چن چن کر مارا گیا۔ قوم نے قسم کھائی: "بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے۔"

(2015 - 2018) باب انیسواں: ڈریگن کی آمد اور پانامہ کا طوفان

منظر 1: سی پیک کا خواب

کا (CPEC) چین نے پاکستان میں 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری اعلان کیا۔ گوادر، موٹرویز اور بجلی گھر بننے لگے۔ ملک ترقی کی راہ پر گامزن نظر آ رہا تھا۔

منظر 2: پانامہ اور اقامہ

پھر پانامہ پیپرز کا دھماکہ ہوا۔ نواز شریف کے خاندان کے نام سامنے آئے۔ عمران خان نے "تلاشی دو" کا نعرہ لگایا۔ سپریم کورٹ نے جے آئی ٹی بنائی۔ فونٹ اور اقامہ کے تکنیکی نکات پر نواز شریف کو نااہل قرار دے دیا گیا۔ "نواز شریف نے جی ٹی روڈ پر پوچھا: "مجھے کیوں نکالا؟" سیاسی عدم استحکام واپس آ گیا۔ 2018 میں عمران خان "نیا پاکستان" کے نعرے کے ساتھ وزیراعظم بنے۔

(2021 - باب بیسواں: سائفر کا سایہ اور آدھی رات کی عدالت
2022)

منظر 1: عدم اعتماد

پر (Same Page) "عمران خان اور اسٹیبلشمنٹ کے" ایک صفحے
در اڑ پڑ گئی۔ اپوزیشن متحد ہو گئی۔

عمران خان نے اسلام آباد کے جلسے میں ایک خط لہرایا: "یہ سائفر ہے، یہ
"امریکی سازش ہے۔"

اپریل 2022 کی رات - 9

سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے دروازے رات 12 بجے کھل گئے۔
پارلیمنٹ میں تحریک عدم اعتماد پرووٹنگ ہوئی۔ عمران خان وزارتِ عظمیٰ
سے ہٹا دیے گئے اور شہباز شریف وزیرِ اعظم بنے۔

عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا: ایک طرف
"حقیقی آزادی" کا بیانیہ، دوسری طرف "آئین کی بالادستی"۔

(2023 - باب اکیسواں: 9 مئی کی راکھ اور "فارم 47" کا معمہ
2025)

منظر 1: 9 مئی کا یومِ سیاہ

عمران خان کو اسلام آباد ہائیکورٹ سے گرفتار کیا گیا۔ رد عمل میں عوام کا
غصہ "ریڈ لائن" عبور کر گیا۔

لاہور میں جناح ہاؤس اور راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے گیٹ پر حملے ہوئے۔
فوجی تنصیبات کو جلایا گیا۔

ریاست نے سخت ترین کریک ڈاؤن کیا۔ ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے،
پارٹی لیڈر شپ بکھر گئی۔

منظر 2: الیکشن 2024 اور آج

فروری 2024۔ انٹرنیٹ بند تھا۔ "بلا" چھین لیا گیا تھا۔ لیکن ووٹرز 8
نکلے۔

رات کو نتائج کچھ اور تھے، صبح ہوتے ہوتے "فارم 47" نے بازی پلٹ
دی۔ ایک کمزور مخلوط حکومت وجود میں آئی۔

:آج (دسمبر 2025)

ہم یہاں کھڑے ہیں۔ مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔ سیاست جمود کا شکار ہے۔ عمران خان جیل میں ہیں لیکن ان کا بیانیہ زندہ ہے۔ سرحدوں پر دہشت گردی پھر سراٹھا رہی ہے۔

لیکن... اس سب کے باوجود، یہ قوم ناامید نہیں ہے۔ یہ وہ مٹی ہے جسے جتنا دبایا جائے، یہ اتنی ہی زرخیز ہو کر ابھرتی ہے۔

اختتامیہ: سفر جاری ہے

یہ ہے 1876 سے لے کر آج تک کی کہانی۔

ہم نے جناح کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا، اقبال کے خوابوں میں رنگ بھرے، 1965 میں ٹینکوں کے سامنے لیٹے، 1971 میں اپنا بازو کٹوایا، 1998 میں پہاڑ کا سینہ چیر کر ایٹمی دھماکے کیے، اور دہشت گردی کے خلاف اپنے بچوں کے جنازے اٹھائے۔

یہ ناول ختم نہیں ہوا۔ اس کا اگلا صفحہ خالی ہے۔

کیونکہ پاکستان ایک "مکمل شدہ کتاب" نہیں، بلکہ ایک "جاری کہانی" ہے۔ اس کا اگلا باب آپ کو اور مجھے اپنے کردار اور عمل سے لکھنا ہے۔

۔۔۔ تمام شد۔۔۔